وفیات

ہے رشک اک جہان کو "سرور" کی موت پر

ڈاکٹر محمد شکیل اوج

شعبہ ابلاغ عامہ جامعہ کراچی کے ایسوسی ایٹ پروفیسر، سرور نسیم کی یاد میں

جامعہ کراچی کی تاریخ کا سب سے بڑا جنازہ میرے مرحوم دوست سرور نسیم کا تھا۔ جن کا ۱۶ فروری ۲۰۰۷ء کو اچانک انتقال ہوا۔ اس سانحہ پر جامعہ کی فضا سوگوار اور ہر آنکھ اشکبار تھی۔ اتنی کثرت اور ایسا اژدھام اس سے پہلے دیکھنے میں نہ آیا۔ مرحوم اپنی عمر کے اڑتالیسویں سال میں تھے۔ بظاہر ہشاش بشاش، تندرست وتوانا اور صحت مند دکھائی دیتے تھے سوائے اس کے کہ گذشتہ کئی ماہ سے بلڈ پریشر کی شکایت بتاتے تھے۔ اور اسکے لئے وہ خاصے فکرمند بھی تھے۔

مرحوم سے میری دوستی کا رشتہ اس وقت قائم ہوا۔ جب میں پروفیسر ڈاکٹر محمد قیصر کی اسٹوڈنٹ ایڈوائزری ٹیم میں بطور اسسٹنٹ شامل ہوا۔ مرحوم اس ٹیم میں بہت پہلے سے شامل تھے۔ اس طرح تقریباً روزانہ ہی کبھی کم اور کبھی زیادہ وقتوں کی ملاقاتیں رہنے لگی تھیں۔ انکی خوش مزاجی میں سنجیدگی کی ملونی تھی۔ وہ طلبہ تنظیموں کو شفقت ومحبت سے ڈیل کرنے کے قائل تھے۔ طبیعت میں صلح پسندی کا جوہر بھی مبداء فیاض سے ودیعت ہوا تھا۔ حقدار کو حق دلانے میں پیش پیش رہتے تھے اور اگر کسی کا حق مارا جاتا تو مضطرب ہو جاتے تھے۔ تقریباً دو سال تک ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ اس عرصہ میں میں نے انہیں بلا مبالغہ ایک با اخلاق، با اصول اور شریف النفس انسان پایا۔ ان کے سانحہ ارتحال پر انکی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر ان کے متعدد دوستوں نے جو اظہار خیال کیا ہے۔ وہ اظہار واقعی ہے۔ اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی شرافت ودیانت اور

اصول پسندی کا دورانیہ فقط دو ایک سالوں پر نہیں بلکہ انکی پوری زندگی پر مستولی تھا۔

ان کی وفات سے ایک ہفتہ قبل ان سے میری آخری اور یادگار ملاقات ہوئی تھی۔ میں ان سے ملنے ان کے دفتر گیا تھا۔ اس ملاقات کا قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ اس بار انہوں نے قدرے غیر معمولی انداز میں میرا استقبال کیا اور اپنے ساتھ والی کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ اس ملاقات میں تین مرتبہ ایسا ہوا کہ جب بھی میں نے ان سے رخصت چاہی، انہوں نے اٹھنے نہ دیا بلکہ ہاتھ پکڑ لیا اور نہایت بے تکلفی سے کہا دکتور! بیٹھے رہو کہاں جاؤ گے؟ میں نے کہا گھر۔ کہنے لگے، گھر جا کر کیا کرو گے؟ تھوڑا وقت ہمیں بھی دے دیا کرو اور میں ان کے کہنے پر تینوں مرتبہ بیٹھ گیا۔ اسی اثناء میں انہوں نے چائے کا بھی پوچھا مگر میں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ مجھے سخت بھوک لگی ہے۔ اس لیے چائے نہیں پیوں گا۔ مگر شاید وہ خود پینا چاہتے تھے اس لیے منگوالی اور اس دوران میں بھی ان کی اجازت سے گھر آ گیا۔ ملاقات میں پتہ چلا تھا کہ اگلے دن انہیں اسلام آباد جانا ہے۔ اور جامعہ میں منعقد ہونے والے ایک سیمینار کے انتظامات بھی ان کے ذمہ ہیں یہ وہ سیمینار تھا، جو ان کی زندگی کا آخری سیمینار ثابت ہوا۔

ماہِ رمضان میں مرحوم جس انہماک اور خلوص سے مسجد میں نماز تراویح کے لئے آیا کرتے تھے وہ مناظر بھی قابل یاد ہیں۔ باالعموم عشاء کی اذان وہ گھر میں نہیں مسجد میں آ کر سنتے تھے۔ پھر پہلی صف میں بیٹھنے کا خصوصی اہتمام کرتے۔ ان کی یہ ادا میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ مرحوم ایکدن میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ مجھے ایک فتویٰ لینا ہے کیا تم فتویٰ دے سکتے ہو؟ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور مسکرا کر پوچھا۔ مسئلہ کی نوعیت کیا ہے؟ کہنے لگے وراثت کا مسئلہ ہے، میں نے کہا پوچھو! کہنے لگے میں لکھ کر پوچھوں گا۔ پھر اگلے روز وہ میرے پاس آئے اور استفتا میرے ہاتھوں میں تھما دی۔ پھر تفصیلی جواب کے طالب ہوئے۔ یہاں عرض یہ کرنا مقصود ہے کہ حمایت حق کی جو خوبی اس وقت میں نے ان کے اندر پائی وہ یہ تھی کہ وہ فقط خدا خوفی کے باعث شریعت اسلامیہ کے مطابق وراثت کی تقسیم چاہتے تھے، خواہ ان کے اپنے حصے میں کچھ آئے یا نہ آئے؟ اور یہ دراصل ان کے اپنے من کی وہ سچی پکار تھی، جو ان کا شعار بن چکی تھی۔ رزق حلال کمانا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ اور وہ اکثر ایسی ہی باتیں کرتے نظر بھی آتے تھے۔ دوسروں کو ترغیب بھی وہ ایسی

ہی باتوں کی دیتے تھے۔ بظاہر تو وہ جوان تھے۔ مگر قدرت نے انہیں دماغ کسی "بزرگ ناصح" کا دیا تھا۔

وہ حد درجہ قابل اعتبار تھے اور رازوں کے امین۔ انجمن اساتذہ کے وہ صدر بھی رہے۔ اور جنرل سیکریٹری بھی اور موجودہ شیخ الجامعہ پروفیسر ڈاکٹر پیرزادہ محمد قاسم رضا صدیقی کے میڈیا ایڈوائزر بھی اور اس کے علاوہ بھی متعدد عہدوں کے حامل رہے۔ اس عرصہ سیاست وخدمت میں ان کے پاس متعدد اساتذہ کی تحریری شکایتیں موصول ہوئیں مگر وہ کسی کو یہ نہیں بتاتے تھے کہ کس نے کس کی شکایت لکھ کر بھیجی ہے۔ الا یہ کہ خال خال۔ تاہم جسکے بارے میں شکایت ہوتی اسے بھی اور جو شاکی ہوتا اسے بھی سمجھانے کی کوشش ضرور کرتے تھے۔ اور نیک مشوروں سے نوازتے تھے۔ مرحوم نے پسماندگان میں بیوہ پانچ بیٹیاں اور ایک دو سالہ بیٹا یادگار چھوڑا ہے۔ اللہ ان سب کو صبر جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ مرحمت فرمائے۔ (آمین)

موت سے کس کو رستگاری ہے؟
آج وہ کل ہماری باری ہے

عرب اور موالی
(تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی)
ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر
صفحات: ۳۴۸
قیمت: ۳۰۰ روپے
ناشر: قرطاس
پی او بکس 8453،
کراچی یونیورسٹی، کراچی

- نام کتاب: احادیث القرآن (قرآنی حدیثیں)
نام مصنف: ڈاکٹر ازھر ازھری
سن اشاعت: ۲۰۰۶ء
قیمت: ۱۲۰ روپے۔ صفحات: ۱۵۴
ناشر: ایس ایس ٹریڈرز انٹرنیشنل کراچی پی او بکس ۱۸۰۷۷
تبصرہ نگار: محمد اعظم سعیدی

ڈاکٹر ازھر ازھری کے نزدیک ذخیرہ احادیث چونکہ حضور اکرم ﷺ کے وصال سے تقریباً دو سو سال بعد جمع ہوا ہے جبکہ رسول اللہ ﷺ سے براہ راست سماعت کرنے والے صحابہ بھی بقید حیات نہ تھے کہ وہ اپنی ذات سے منسوب روایات کی تصدیق وتائید فرماتے اس لئے اس ذخیرہ کو احادیث کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ اس حوالے اس ان کی پہلی کتاب کا نام "قرآن وحدیث" ہے جس میں انہوں نے اپنے نقطہ نظر سے یہ ثابت کیا ہے کہ بخاری ومسلم سمیت جو کچھ حدیث کی کتابوں میں حدیث کے نام سے موجود ہے وہ سب سنی سنائی ناقابل اعتبار روایت ہیں اور ان کتب حدیث میں حدیث ایک بھی نہیں ہے۔

زیر نظر کتاب "احادیث القرآن" اسی سلسلے کی دوسری کتاب ہے جسکے تعارف میں احادیث رسول کے زیر سایہ احادیث قدسیہ پر بھی آلات سرجری استعمال کر کے سابقہ عنوان کے ضمن میں لکھا گیا ہے کہ احادیث رسول اور احادیث قدسی خود قرآن مجید میں موجود ہیں۔ قرآن سے باہر مختلف کتب احادیث میں جو احادیث قدسی یا احادیث رسول کے نام سے معروف ومشہور ہیں وہ روایت پرست حضرات نے ادھر ادھر سے سن سنا کر اسے روایت کا نام دینے کے بجائے قرآن سے لفظ حدیث چرا کر اسے حدیث رسول اور حدیث قدسی کا نام دے دیا ہے۔ بعد ازاں حسب روایت وہی تنقید واعتراضات کا طومار کہ شیخ الحدیث کا عہدہ حاصل کر لیا قرآن کے ساتھ تو صحیح نہیں لکھا جاتا مگر بخاری ومسلم سے پہلے صحیح لکھا جاتا ہے حافظ قرآن کے مقابلے میں حافظ حدیث کی اصطلاح گھڑ لی گئی۔ محیر العقول اور غیر معمولی حافظہ عربوں کا تھا مگر صحاح ستہ کے مؤلفین ایرانی ہیں جیسے سطحی اور استہزائی اعتراضات ہیں جو صدیوں سے دہرائے جارہے ہیں اور بالا ستیعاب انکے جوابات بھی دیئے جارہے ہیں۔

البتہ ڈاکٹر ازھر کی اس بات میں واقعی وزن ہے کہ دو صدیوں بعد جمع کی جانے والی روایات کو من وعن رسول اللہ کے الفاظ یعنی حدیث رسول کہا جائے یا انہیں روایات کا نام دیا جائے۔ اور مؤلف کا نکتہ نظر یہ ہے کہ ان کو روایات کا نام دیا جائے۔ مگر یہی مؤلف اپنے اس مؤقف سے اس وقت گریز کرتے نظر آتے ہیں جب وہ کتب احادیث کا استہزاء اڑاتے ہوئے احادیث کے ساتھ ساتھ روایات کی نفی کر جاتے ہیں یعنی جب دونوں کی حیثیت کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں تو پھر حدیث کو روایت کہنے کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے بایں ہمہ ان کا موقف یہی ہے کہ جو کچھ ہے قرآن ہے حدیث کا کوئی وجود نہیں ہے نیز قرآن میں حدیث کو ہی قرآن کہا گیا ہے اور اپنے اس قول کی تقسیم وہ اس طرح کرتے ہیں کہ قرآن مجید میں کل اکیس مرتبہ لفظ حدیث مذکور ہوا ہے سورۂ نساء آیت ۸۷ مرسلات آیت ۵۰۔ یوسف آیت ۱۱۱۔ کہف آیت ۶۔ زمر آیت ۲۳۔ جاثیہ آیت ۶۔ نجم آیت ۵۹۔ طور آیت ۳۴۔ واقعہ ۸۱۔ القلم آیت ۴۴ میں جو لفظ حدیث آیا ہے اس سے مراد قرآن مجید ہے جبکہ سورۂ نساء آیت ۴۲۔ ۸۷۔ ۱۴۰ اور سورۂ تحریم آیت ۳ میں جو لفظ حدیث آیا ہے اس کا معنی بات ہے، اسی طرح سورۂ ذاریات آیت ۲۴۔ نازعات آیت ۱۵۔ بروج آیت ۱۷۔ غاشیہ آیت ۱ میں حدیث سے مراد خبر ہے۔ اور سورۂ انعام کی آیت ۶۸ میں حدیث بمعنی گفتگو اور سورۂ لقمان میں لھوالحدیث بمعنی قصہ کہانی ہے۔ اس تقسیم سے مؤلف نتیجہ یہ نکالتے ہیں کہ اپنے معنی ومفہوم کے اعتبار سے حدیث کا اطلاق صرف اس لفظ پر ہوتا ہے جو قرآن میں وارد ہے یعنی قرآن سے باہر لفظ حدیث کی کسی نسبت کو وہ قبول نہیں کرتے۔

اس طرح مذکورہ تالیف میں قرآن وحدیث یا قرآن وسنت کی اصطلاح کو بھی لائق اعتناء نہ سمجھتے ہوئے اس ترکیب کو مفروضہ قرار دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مؤیدین حدیث کے نزدیک شاید آدھا دین قرآن میں ہے اور آدھا دین حدیث یا سنت میں ہے یعنی موصوف کے نزدیک دینی عقائد ونظریات، اور امرونواہی، اخلاقیات ومعاملات، عائلی موزوں معاشرتی ضروریات کا ماخذ صرف اور صرف قرآن مجید ہے احادیث مجموعی طور پر مفروضہ محض ہیں۔ پھر مؤیدین حدیث کی طرف سے خود ہی ایک آسان سے سوال کا جواب دے کر (ص ۲۹۔۳۰) اسے استہزاء اڑا دیتے ہیں۔ جس سے قاری کی تشفی نہیں ہوتی۔

ڈاکٹر ازھر نے کتب احادیث اور معہود ذہنی احادیث کی سرجری میں تو کمال فن کا مظاہرہ دکھایا ہے مگر افسوس کہ آلات سرجری مقام آپریشن میں ہی بکھیر بیٹھے ہیں مثلاً سورۂ نساء کی آیت ۸۷ میں لفظ حدیث ایک مرتبہ آیا ہے مگر ترجمہ میں وہ حدیث بھی لکھتے ہیں بریکٹ میں قرآن بھی لکھتے ہیں اور پھر بات بھی لکھتے ہیں یعنی (جو حدیث (قرآن) کی بات) جب حدیث کو قرآن کہہ رہے ہیں تو پھر قرآن کو بریکٹ کرنے اور پھر حدیث کا معنی بات کرنا چہ معنی دارد۔۔۔ اسی طرح سورۂ مرسلات کی آیت ۵۰ فبای حدیث بعدہ یومنون میں کیا ہے (حدیث (قرآن) کی اور کون سی ایسی بات ہے) اس قسم کی مزید مثالیں بھی موجود ہیں یونہی سورۂ یوسف کی آیت ۱۱۱ کا ترجمہ نامکمل کیا ہے۔ سورۂ نساء کی آیت ۸۰ کا ترجمہ نامکمل ہے ص ۵۷، سورۂ نساء کی آیت ۳۶ کا ترجمہ نامکمل ہے ص ۵۸۔ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۱۷، ۱۱۸ درج کی ہے مگر ترجمہ صرف آخری جملے کا ہے ص ۶۷۔ بعض تراجم آیات تو موضوع سے متعلق حصے کے کیے ہی نہیں ہیں۔

اسکے بعد قرآن بحیثیت حدیث کے زیر عنوان لکھتے ہیں کہ ہم نے قرآن کو حدیث کا اصطلاحی نام اس لئے دیا ہے کہ یہ حدیث کی لغوی تعریف پر پورا اترتا ہے پھر اگلے صفحے پر لکھتے ہیں کہ قرآن میں ۲۱ مقامات پر حدیث کا لفظ موجود ہونے کے باوجود کسی ایک مقام پر بھی ہم کو حدیث محمد، حدیث رسول یا حدیث النبی کی ترکیب والے الفاظ نظر نہیں آئے۔ مگر حیرت ہے کہ ڈاکٹر صاحب اسی ص ۴۰ پر قرآن کے صفاتی ناموں میں ایک نام "قول رسول" وہ بھی آیت قرآن سے ماخوذ کر کے خود ہی تحریر فرما چکے ہیں اور وہ قول اور حدیث میں معنوی یکسانیت سے واقف بھی ہوں گے۔ پھر بھی لکھ دیا کہ حدیث الرسول یا حدیث النبی کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہے؟ ڈاکٹر صاحب کی کتب احادیث کے آپریشن میں انہماک ویکسوئی کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ وہ اس کانا پیچی میں قرآنی آیات کی تعداد پر بھی بلیڈ پھیر گئے اور آیات کی تعداد ۶۲۳۶ کر دیں۔

ڈاکٹر ازھر نے قرآنی آیات کی تقسیم میں بھی بڑی عرق ریزی فرمائی ہے۔ سب سے پہلے تو انہوں نے قرآن مجید کو احادیث القرآن کا نام دیا پھر ان میں سے احادیث قدسیہ کو الگ فرمایا۔ اور فرمایا کہ جو آیات یاایھا الذین امنوا۔ یاایھا الناس، یااھل الکتاب اور بنی آدم سے شروع ہوتی ہے یہ آیات درحقیقت احادیث قدسیہ ہیں۔ اسکے بعد لکھتے ہیں وہ آیات جو لفظ